امام خمینیؒ کی غزل گوئی

٭ ڈاکٹر غلام فرید

Ghazal's Recitation of Imam Khomeini

Dr. Ghulam Fareed

Roohullah Khumani (R.A) was a Multi-dimensional personality i.e. Revolutionary Leader, Politician, Religious Scholar, Social reformer etc. But one aspect which he kept secret in his life was his poetry. After his death his poetic work, in which the form of"Ghazal" is most prominent was published. In this article efforts have been made to explore the expertise of Imam Khumani regarding the art of ghazal. Specially reviewing his poetic verses in the light of Persian legacy of poetry.

ڈبلیو۔ پی۔ ییٹس (W. P. Yeats) نے لکھا ہے کہ ”ادب ایک تنہا انسان کا معاشرتی کارنامہ ہے“۔ یوں یہ کہنا حق بجانب ہے کہ ادیب تہذیب انسانی کا معمار اور مؤسس ہوتا ہے۔ عمومی طور پر روح اللہ خمینیؒ کو انقلابی رہنما، عالم اور سیاسی مدبر تصور کیا جاتا ہے۔ مگر جیسے ہر بڑے آدمی کی شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں امامؒ بھی کئی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے کمال مہارت سے اپنی شاعرانہ جہت مخفی رکھی۔ امام فکری طور ڈاکٹر علی شریعتی اور علامہ اقبالؒ سے متاثر تھے۔ یقیناً دونوں کی انقلابی سوچ اس شعرگوئی کی محرک رہی ہوگی مگر شاید اول الذکر کا فن بھی انہیں کچھ نہ کچھ فیسی نیٹ کرتا ہوگا۔

ان کی شاعری ان کی رحلت کے بعد جب کتابی شکل میں سامنے آئی تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ وہ تو فارسی شاعری کی روایت سے نہ صرف استفادہ کرتے رہے بلکہ اس روایت کو آگے بھی بڑھاتے رہے جو حافظ شیرازیؒ اور مولانا رومؒ اور عطارؒ و سعدیؒ کی قائم کردہ تھی۔ فنون لطیفہ انسانی جمالیات کے اظہار کا بہترین وسیلہ ہیں۔ شاعری اعلیٰ و ارفع دماغ کی اختراع ہوتی ہے اور عجمی روایت میں غزل شاعری کی مشکل ترین اصناف میں سے ایک ہے۔ قافیہ و ردیف کی پابندی کو خیال آفرینی سے ہم

☆ ماڈل کالج فار بوائز، آئی ٹین ون، اسلام آباد

آہنگ کرنا فنکاری کی معراج ہی سے ممکن ہے۔

امام خمینیؒ کی غزل ہیئت اور موضوع ہر دو اعتبار سے قدیم ایرانی روایات کا تسلسل ہے۔ بادہ و ساغر، محبوب، عشق، میکدہ، مستی و خرابات، طوطی و بلبل جیسی اصطلاحیں غزل کی پہچان تھیں جنہیں انہوں نے برتا۔ امام کا اسلوب، طرزِ عراقی مانا جاتا ہے جبکہ اس کے علاوہ طرز خراسانی، طرز ہندی اور جدید اسالیبِ عصر کی بازگشت کے نام سے موجود تھے۔

کوتاہ سخن کہ یار آمد با گیسوی مشکبار آمد

(ترجمہ) قصہ مختصر کرو کہ یار وہ اپنی خوشبودار گیسوؤں کے ساتھ چلا آیا۔

یعنی گیسوئے یار کی خوشبو اس کی آمد کا اعلان ہے۔ یہاں یہ گیسو قمیصِ یوسفؑ کے ہم پلہ لگتے ہیں۔ سچے عاشق اپنے دکھوں کا مداوا نہیں چاہتے جیسے غالب نے کہا تھا:

دردمند منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا ، بُرا نہ ہوا

امامؒ نے بھی بیماری کا اقرار کیا مگر وہ اپنے زخموں کو ہرا رکھنے کے متمنی ہیں:

درد خواہم دوا نمی خواہم غصہ خواہم نوانمی خواہم

میں درد چاہتا ہوں دوا نہیں غم کی جستجو میں ہوں نوا نہیں چاہتا

ارفع ادب وہی ہے جو انسان کی خوابیدہ قوت عزم کو بیدار کرے۔ قوموں اور معاشروں میں عقل و دانش اور تدبر و تفکر کے بیج بوئے اور اشخاص اس قابل ہو جائیں کہ وہ الفاظ کی بجائے نہاں خانہء معانی سے مباحثہ کر سکیں۔(۱)

نوروز اہل فارس کا صدیوں پرانا تہوار ہے جو بہار کی آمد پر منایا جاتا ہے۔ جاڑے کے رخصت ہونے کے بعد پھول کھلتے ہیں۔ سبزہ لہلہاتا ہے۔ منجمد زندگی میں حرارت دوڑ جاتی ہے۔ اس خوشی و سرمستی کے موقع پر شاعر بھی اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ امام کے شعر اس عید کے دن بھی جداگانہ نقطۂ نظر کے حامل نظر آتے ہیں:

جائیں سب دشت میں یا سوئے چمن عید کے دن میکدے ہی میں لگاؤں گا میں رخ سوئے خدا

شاہ و درویش کو نو روز مبارک ہو مگر یارِ دلدار کرے آکے درِ میکدہ وا

گر سَر پیر خرابات کا رستہ مل جائے سر کے بل طے کروں یہ راہ میں قدموں کی جگہ

(ترجمہ، ابن علی واعظ)

ان کے ہاں شاعرانہ تعلی بھی دیکھی جا سکتی ہے جو ان کے قلندرانہ مزاج پر دال ہے۔ جاہ و حشمت اور مال و منال سے لاتعلقی ملاحظہ ہو:

مرے دل میں جام جم ہے، نہ ہی مسندِ سلیماں کہ مزاجِ خسروانہ مجھے حق سے مِل گیا ہے

یہ الگ بات ہے کہ اپنی عملی زندگی میں اس شاعرانہ تعلی کو وہ سچ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ایران ایک کلچرڈ (تہذیب یافتہ) ملک تھا اور ادب کلچر کا اہم ستون سمجھا جاتا ہے۔ یہ تمدن ہی ہوتا ہے جو قوموں کی انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور نہ صرف انفرادیت بلکہ ان کی بقا کا ضامن بھی۔ امامؒ نے اسی بارے میں کہا تھا:

"بنیادی طور پر ہر معاشرے کا کلچر ہی اس معاشرے کی ماہیت اور وجود کو تشکیل دیتا ہے۔ کلچر خراب ہونے کی صورت میں چاہے معاشرہ، سیاسی، اقتصادی، صنعتی اور فوجی لحاظ سے طاقتور اور قوی ہی کیوں نہ ہو بے کار اور اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔"(۲)

شاعری اعلیٰ تہذیبی مذاق کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ امام راحلؒ نے ساقی اور مے خانہ کو جب برتا ہے تو مولانا رومؒ اور اقبال کے قریب ہو گئے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر خالصتاً ایک شاعر کا خیال ذہن میں ابھرتا ہے اور دل چاہتا ہے ان اشعار کے فقط آہنگ سے محظوظ ہوا جائے نہ کہ شارح سے رجوع کیا جائے۔

چشم ساقی کی ہوس ہے تو بہک جاؤ تو بھی ہاتھ لہرا کے شریک صفِ مستاں ہو جا
اس کے ابرو کی جو محراب میں پڑھتا ہے نماز صدیاں درکار ہیں، اس راہ میں گرداں ہو جا

اردو شاعری میں عشق اور عقل کو اقبالؒ نے دو متحارب قوتیں بتایا ہے۔ عشق اپنی ہستی کو مٹا کر بھی مقصد کو پالینا کامرانی گردانتا ہے جبکہ عقل عیار ہے سو بھیس بدل کر انسان کو سود و زیاں کے خوف میں مبتلا کرتا ہے۔ امام کی غزل ان کے مشرب کو عیاں کرتی ہے:

واکیا عشق کا در ، بند کیا عقل کا در سر میں جتنا بھی سماتا گیا سودا تیرا

فراق کا مضمون جتنی تڑپ شاعر کے دل میں پیدا کرتا ہے اس سے فزوں تر رنگ شعر کے اندر اجاگر ہو جاتا ہے۔ دلبر سے دوری اور ہجر کے لمحات عاشق پر کیا قیامت ڈھاتے ہیں امام خمینیؒ نے اس کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ بے ساختہ منہ سے کلمہ واہ ادا ہو جاتا ہے:

مدت ہوئی کہ ہوں میں غم، ہجر دوست میں مُرغِ درون ِ آتش و ماہی برونِ آب

یہاں دوسرے مصرعے میں صنعت تضاد سے کام لیا گیا ہے۔ درون اور برون کے صوتی آہنگ اور معنوی بُعد نے حسن پیدا کر دیا ہے۔ آتش و آب نہ صرف دو انتہاؤں کے نمائندے ہیں بلکہ دونوں زندگی اور موت کی علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ غزل شاعری کی مشکل ترین صنف ہے کیونکہ اس کے ایجاز میں جامعیت اور علائم میں حقائق چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ امامؒ کے کلام سے ان کی قادر الکلامی اور فن پر گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرمان فتح پوری نے غزل پر بات کرتے ہوئے کہا تھا یہ زندگی کے ہر پہلو اور معاشرے کی ہر روش زیر بحث لاتی ہے مگر مختصراً اور کنایات اور علامات کے ساتھ:

"گویا غزل کی یہ سادگی بڑی پرکار سادگی ہوتی ہے اور غزل کے اچھے شعر میں جو کچھ کہہ دیا جاتا ہے وہ کوزے میں سمندر بند کرنے کے مصداق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ شرائط بڑی کڑی ہیں اور یہی شرائط غزل کو کٹر صنفِ یا مشکل ترین صنفِ سخن بناتی ہے۔"(۳)

مندرجہ ذیل شعر ملاحظہ ہو:

تا کہ مستغرق شدم در قعر بحر بی خودی　　سر بہ سر دریا شدم نہ جوئی ماندونہ غدیر

(ترجمہ) بے خودی کی گہرائی میں ایسا مستغرق ہوا ہوں کہ جھیل تھا یا نہر، اب تو سر بہ سر دریا بن گیا ہوں ندی رہی اور نہ ہی جھیل!

روایتی تعلیم اور پند و نصایح ازل سے شاعری کا تختہ مشق رہے ہیں۔ امام خمینیؒ نے بھی متعدد مقامات پر اپنے شعروں میں اس کو موضوع بنایا ہے۔:

(۱) جمع کیں خوب کتابیں ، نہ ہوا پردہ چاک　　بزم تدریس میں بیٹھے رہے رستہ نہ ملا

(۲) درمے خانہ پہ جویائے اماں آیا ہوں　　فکر صوفی سے گھبرا کے یہاں آیا ہوں

بند کردے یہ درمدرسہ اے شیخ! کہ میں　　تیری باتوں سے بہت تنگ یہاں آیا ہوں

یہاں شاعری میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بات کی گئی ہے جو مذہبی حلقوں اور سطحی فکر کے حاملین کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیونکہ افلاطون کے خیال میں فلسفہ ایک قسم کی دید ہے یعنی نظارہ حق کی دید یہ خالص عقلی نہیں ہے یہ محض دانائی نہیں ہے بلکہ حق و صداقت اور وجود مطلق کا عشق ہے۔(۴)

امام کے عمومی پیروکار بھی غالباً ان کی غزل سے زیادہ آسودہ نہ ہونگے۔ دیوانِ امام خمینیؒ کے اردو مترجم کا فرمانا ہے:

"امام کے کلام میں جو بادہ و ساغر، خال، لب، چشم ملبوس، میکدہ، عشق، دلبر، دلدار، مستی اور خرابات اور اس طرح کے کثیر الفاظ استعمال ہوئے ہیں انہیں ان کے لغوی معانی میں نہیں بلکہ عرفانی معانی میں سمجھنا چاہیے۔"(۵)

میری رائے میں بڑی شاعری کو کسی بھی جامے میں مقید کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ بنیادی شرط البتہ یہ ہے کہ شاعری کو شاعری کی طرح پڑھنا چاہیے۔ کلام میں ابہام پر قطعیت کا اطلاق نامناسب ہے۔ کیونکہ اکہری معنویت کے حامل شعر پر شاید یہ تفہیمی جبر قابل قبول ہو مگر جہاں معنی میں کثریت اور ابہام ہو تو ہر زمان اور ذہن کا قاری مطالب اپنی مرضی سے اخذ کرے گا۔ ملوکیت نے جتنا نقصان مذہب کا کیا اس سے کہیں زیادہ ادب اور فنون لطیفہ کو ضعف پہنچایا ہے۔ شاہی و درسی تاریخ میں شاعری کے ساتھ شعرا کو بھی زندیق لکھا گیا۔ عربی کے بعد فارسی اور اردو شاعری کے ساتھ یہ رویہ روا رکھا گیا۔ ابن کثیر دمشقی نے اپنی کتاب البدائیہ و النھائیہ میں اس حدیث کو بھی ضعیف قرار دیا ہے جو امراء القیس کے دوزخی ہونے کے متعلق ہے۔ غالب و اقبال کا تصور جنت ہرگز روایتی نہ تھا۔ امام کا مسلک دیکھیے کیا ہے:

کہہ دو یہ مدعی سے، جنت تجھے مبارک دیدار یار، روح سر نہاں ہمارا

فلسفی کا سروکار کائنات سے رہا ہے اور اس سلسلے میں مقدم سوال انسان کی ماہیت و غائیت کے بارے اٹھایا ہے۔ گوئٹے کا سپر مین ہو یا اقبال کا مردِ مومن یہ حقیقی عروج آدم کے نمائندے ہیں۔ مجذوب فرنگی کو مقام کبریا سمجھانا ہو یا خود خدا بندے سے اس کی رضا پوچھ رہا ہو اس میں بھی عبد کے مقام کا تعین مدعا ہے۔ امام خمینیؒ نے اسی مضمون کو غزل میں باندھا تو بے ساختہ اقبال کا شعر ذہن میں اُبھرا:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

امام یوں گویا ہوا:

باشندگانِ کوہِ ہدایت ہیں اہل عشق سدرہ پہ جبریل مری جستجو میں ہے

بے پردگی! ہیں جلوے تیرے عرش سے پرے مخلوط تیرا عشق ہمارے لہو میں ہے

یہاں ہمیں جذبے کی سچائی اور احساسِ تفاخر نظر آتا ہے۔ فکری معراج اس سطح پر نظر آتا ہے جو بڑے شعراء کا شیوہ ہے۔ غالب نے کہا تھا:

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ، ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

کوہ طور پر جا کر موسیٰؑ کی ہمسری کا یہاں مشورہ ہے۔ سدرۃ المنتہٰی سے آگے بڑھ جانا دعویٰ ہے۔ مالک کے عشق کا عبد کے لہو میں خلط ہونا فلسفے کا موضوع ہے اور اس گتھی کو سلجھانے کی تصوف نے ضرور سعی کی ہے۔ انسان کامل کی اصطلاح بھی پہلے پہلے شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "فُصوص الحکم" میں استعمال کی۔ امام نے مندرجہ بالا شعر میں عبد کے اسی مرتبے کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر نفیس اقبال نے شاعری اور تصوف کے تعلق کو زیر بحث لاتے ہوئے A. J Arberry کے حوالے سے لکھا:

"انسان کامل کائنات کا ایک ایسا خلاصہ ہے جس کی ذات میں خدا کی صفات کا ملہ منعکس ہوتی ہیں۔ اس لیے انسانِ کامل ہی دراصل تخلیق کائنات کی علت ہے۔"(۶)

یہ ندرت خیال کا عمدہ اظہار ہے۔ غزل میں استفہامیہ اور طنزیہ انداز ایک ایسا آلہ ہے جس سے فن میں نکھار آتا ہے۔ ادب میں عموماً یہ بات میں وزن پیدا کرنے کے واسطے برتا جاتا ہے۔ امام خمینیؒ نے یوں سوال پوچھا :

(۱) تو نے فراقِ رُخ سے مرا دل کیا کباب انصاف تو ہی کر کہ یہ سزا ہے سزائے دوست؟

(۲) پاس کس کے ترے غمزے کی شکایت لے جاؤں کس سے بتلاؤں کہ سرِ چشمہ آزار ہے تو

عبدالرحمٰن بجنوری کا کہنا ہے کہ شعر متحرک شے ہے۔ یہ ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا

ہے۔(۷)

امام کی غزل میں اس بات کے ثبوت جا بجا ملتے ہیں۔مثلاً

جانا جو اے صبا کبھی سوئے سرائے دوست　　کہنا کہ خم نہ ہوگا یہ سر جز بہ پائے دوست

غزل جیسے مشکل فن میں دقیق نکتہ سنجی ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔امام خمینیؒ کے شاعرانہ پہلو کی جوں جوں جستجو آگے چلے گی ان کی شاعری اپنا اثبات کرتی چلے جائے گی۔اور یہ بہت لازم ہے کہ تقدس کے ہالے سے باہر نکل کر ان کے کلام کو سمجھا جائے:

دیر و بت خانہ میں اور بت کدہ و مسجد میں　　سر جھکایا کہ تو شاید ہو کہیں جلوہ نما

شاعری میں دانائی اور حکمت کے موتی بکھیرنا دانائے راز کا کام ہے:

ضمیر امتان رامی کند پاک　　کلیمے یا حکیمے نے نوازی

جنگ و جدل اور قتال سے قوموں کی تقدیریں نہیں بدلا کرتیں۔اس کے لیے کلیم یا حکیم کی ضرورت پڑتی ہے۔

امام خمینیؒ کی غزل میں ان رازوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے جو معاشروں کو متمدن بناتے ہیں۔ان کے لحن میں سرمدی نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ایک طرف ہر شعر ادب پارہ ہے تو دوسری طرف لفظ حکمت کا گوہر ہے۔امام کی غزل میں مذہبیت اور فلسفہ یا نظریہ ڈھونڈنے کی بجائے فن شاعری کی ءمروجہ سانچوں کو مدِنظر رکھ کر تنقیدی مباحث صائب راستہ ہے۔مادہ پرستی اور سرمایہ داری اور مطلق العنانیت نے دنیا کے انسانوں کو تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔انسانیت اب کسی مزید اجارہ اور جنگ کی متحمل نہیں ہوسکتی۔فنون میں یہ وسعت ہے کہ وہ امن و آشتی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ہینڈرک کریمر (Hendrick Creamer) کے حوالے سے شمیم حنفی نے لکھا ہے:

"فلسیفانہ اور مذہبی بوقلمونی اور لاغری کے موجودہ دور میں ساری دنیا کے مہذب انسانوں کے درمیان سب سے زیادہ آفاقی اور سمجھ میں آنے والی زبان فن کی زبان ہے۔اور اسی طرح عملی طور پر آج کا متبادل مذہب اور روحوں کا عظیم فاتح ہے۔"(۸)

امام خمینیؒ کی بطور شاعر حیثیت کا تعین نہایت اہم ہے۔ان کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تا کہ ان کا ادبی مقام معیارات کے مطابق از سر نو طے کر کے دنیا میں پیش کیا جا سکے۔

حوالہ جات:

(۱)　محمد سہیل عمر/طاہر حمید تنولی،مقالات جاوید۔اقبال اکادمی لاہور،2011ء،ص 400

(۲)　مدیر ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری،سہ ماہی پیغام آشنا۔شمارہ 7 ، ستمبر 2001ء

(۳)　ڈاکٹر فرمان فتح پوری،اُردو غزل،نعت اور مثنوی۔الوقار پبلی کیشنز لاہور۔2014ء ،ص12

(۴) برٹرینڈرسل،ترجمہ پروفیسرمحمدبشیر۔فلسفہ مغرب کی تاریخ۔پورب اکادمی اسلام آباد۔2006ء ,ص164
(۵) امام خمینیؒ ترجمہ ابن علی واعظ۔دیوان امام خمینی۔الموسستہ الاسلامیہ لاہور۔1418 ہجری ,ص7
(۶) نفیس اقبال, اُردو شاعری میں تصوف،میر،سودااور درد کے عہد میں۔سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور 2001ء
(۷) فیاض محمود/اقبال حسین،تنقید غالب کے سو سال۔پنجاب یونیورسٹی لاہور،1969ء ,ص131
(۸) شمیم حنفی،جدیدیت اور نئی شاعری۔سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،2008ء ,ص222

***